مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان روابط

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں

جس میں کثیر مذہبی معاشرہ سے متعلق اسلامی تصور، مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سماجی، معاشی و سیاسی روابط کے احکام اور اسلام میں مذہبی رواداری کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کے بارے میں جو بعض غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، ان کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	:	مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان روابط
مصنف	:	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
صفحات	:	۴۰
سن طباعت	:	مارچ ۲۰۱۳ء
قیمت :	:	۳۰روپئے

ناشر

ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی

۱۶۱-ایف، بیسمنٹ، جوگا بائی، پوسٹ باکس نمبر:۹۷۰۸
جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵
فون:011-26981327

ای میل: ifapublication@gmail.com

فہرست مضامین

- کثیر مذہبی معاشرہ اور اسلام ۵
- پوری انسانیت — ایک کنبہ ۸
- شرافتِ انسانی کا تصور ۹
- 'ذمی' کا لفظ اہانت نہیں ۱۱
- سماجی تعلقات ۱۱
- غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک ۱۲
- انسانی زندگی کا احترام وتحفظ ۱۳
- املاک کا احترام ۱۵
- عزت وآبرو کی حفاظت ۱۶
- خوشی وغم میں شرکت ۱۷
- تعلیم وتعلم کا تعلق ۱۸
- معاشی تعلقات ۱۹
- سیاسی تعلقات ۲۰
- سیاسی اشتراک ۲۱
- مبنی بر انصاف قوانین کی اطاعت ۲۲
- ظلم کی مخالفت ۲۴

- مذہبی تعلقات ۲۵
- شریعت اسلامی پر عمل ۲۶
- اپنی شناخت کی حفاظت ۲۷
- دوسرے مذاہب کا احترام اور عدم مداخلت ۲۹
- مذہب پر عمل کی آزادی ۳۰
- عبادت گاہوں کا احترام ۳۱
- جہاد — حقیقت اور غلط فہمی ۳۲
- حیاتِ نبوی ﷺ اور جہاد ۳۵
- جزیہ کی حقیقت ۳۵
- غیر مسلموں سے دوستی ۳۶
- پس چہ باید کرد؟ ۳۹

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل وشعور سے نوازا ہے اور اس کے اندر غور وفکر کی صلاحیت رکھی ہے؛ اسی لئے ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان رائے کا اختلاف بھی پیدا ہوتا رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا کے سارے لوگ ایک ہی مذہب پر قائم نہیں ہیں؛ بلکہ سینکڑوں مذاہب ہیں، جن کے متبعین دنیا میں موجود ہیں اور موجود رہیں گے، قرآن مجید کی نظر میں اگر چہ کہ دین حق ایک ہی ہے؛ لیکن خدا کو یہ منظور نہیں کہ سارے لوگ ایک ہی مذہب کے حامل ہو جائیں، اگر اللہ کا منشاء یہی ہوتا تو سب کے سب اسلام ہی پر قائم ہوتے :

وَلَوْ شَاءَ رَبُّکَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلاَ یَزَالُونَ مُخْتَلِفِیْنَ ، إِلاَّ مَن رَّحِمَ رَبُّکَ (ھود : ۱۱۸-۱۱۹)۔

اگر آپ کے پروردگار چاہتے تو تمام لوگ ایک ہی اُمت (مذہبی گروہ) ہوتے ،مگر لوگ ایک دوسرے سے مختلف رہیں گے، سوائے اس کے کہ جن پر آپ پروردگار نے رحم کیا ہو۔

کثیر مذہبی معاشرہ اور اسلام

گویا قرآن مجید اختلافِ دین کو تسلیم کرتا ہے اور ایک ایسے انسانی سماج کا معترف ہے، جس میں مختلف مذاہب کے حاملین رہتے ہوں، عام طور سے کثیر مذہبی معاشرہ کا بانی مغرب کو سمجھا جاتا ہے؛ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس کی بنیاد اسلام نے رکھی ہے، رسول اللہ ﷺ ہجرت سے

پہلے چاہتے تھے کہ اہل مکہ اگر اسلام قبول نہ بھی کریں تو کم سے کم مسلمانوں کو اسلام پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کی اجازت دے دیں؛ چنانچہ اہل مکہ نے رسول اللہ ﷺ کو صلح کے دو فارمولے پیش کئے، ایک یہ کہ ہم دِنوں کی تقسیم کرلیں، کچھ دن ہماری دیویوں اور دیوتاؤں کی عبادت ہوا کرے، جس میں آپ بھی شریک ہوں، اور کچھ دن آپ کے خدا کی عبادت ہو اور اس میں ہم بھی شرکت کریں، دوسرا فارمولہ یہ تھا کہ دنوں کی تقسیم نہ ہو؛ بلکہ روزانہ آپ کے خدا کی بھی عبادت ہو اور ہماری دیویوں اور دیوتاؤں کی بھی، اور ان دونوں کی عبادت میں آپ کی بھی شرکت ہو اور ہم سب کی بھی، قرآن مجید نے بتایا کہ یہ دونوں فارمولے قابل عمل نہیں ہیں؛ چوں کہ توحید وشرک ایک دوسرے کی ضد ہیں، جس طرح دن ورات اور روشنی وتاریکی ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے، اسی طرح توحید اور شرک کا جمع ہونا بھی ممکن نہیں؛ البتہ قرآن مجید نے ایک تیسرا فارمولہ پیش کیا کہ اگر اہل مکہ ایمان لانے پر تیار نہیں ہیں تو یہ بات قابل عمل ہوسکتی ہے کہ مشرکین اپنے دین پر عمل کریں اور مسلمانوں کو ان کے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت دیں ''لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ'' (الکافرون:٦) — اس طرح ایک ایسا تکثیری معاشرہ وجود میں آسکتا ہے، جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے بقائے باہم کے اصول پر امن کے ساتھ زندگی گذاریں۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اس کی دوسری مثال ہجرت حبشہ کا واقعہ ہے، حبشہ میں حکومت کا مذہب عیسائیت تھا، اگرچہ ٦ رہجری کے بعد رسول اللہ ﷺ کے دعوتی مکتوب سے متاثر ہوکر حبشہ کے فرمانروا اِصحمہ نجاشی نے اسلام قبول کرلیا تھا؛ لیکن جس وقت مسلمانوں نے ہجرت کی، اس وقت بادشاہ عیسائی تھا اور نجاشی کے اسلام قبول کرنے کے بعد بھی حبشہ کے لوگ یا پورے حکمراں گروہ کے ایمان لانے کا ذکر نہیں ملتا؛ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے نجاشی کی وفات پر غائبانہ نماز جنازہ ادا فرمائی؛ البتہ نجاشی ایک عادل اور انصاف ور حکمراں تھا اور اس نے مسلمانوں کو مذہبی آزادی اور شہریوں کو حاصل ہونے والے دوسرے حقوق کے ساتھ حبشہ میں رہنے کی اجازت دی

تھی؛ اسی لئے حبشہ ہجرت کرنے والے صحابہ کرام ﷺ حکومت حبشہ کے ساتھ دلی ہمدردی رکھتے تھے اور جب ان پر بعض دشمنوں نے حملہ کیا اور جنگ کی نوبت آئی تو ان کے لئے دُعاء بھی فرماتے تھے۔

کثیر مذہبی معاشرہ کی تیسری نظیر 'میثاق مدینہ' ہے، جب آپ نے مدینہ ہجرت فرمائی تو اس وقت مدینہ میں تین قومیں آباد تھیں، مسلمان، یہودی اور مشرکین؛ چنانچہ آپ نے ایک معاہدہ کرایا، جس کا حاصل یہ تھا کہ مدینہ میں رہنے والے تمام گروہوں کو اپنے اپنے مذہب پر چلنے کی اجازت ہوگی؛ لیکن جب مدینہ پر کوئی بیرونی دشمن حملہ کرے گا تو سب مل کر مدینہ کا دفاع کریں گے، اس معاہدہ پر آپ نے یہودیوں اور عربوں کے تمام قبائل سے دستخط کروائے، پھر رفتہ رفتہ مدینہ کے مشرکین اپنی مرضی سے مسلمان ہوگئے اور یہودیوں کے ساتھ آپ نے اس معاہدہ کو اس وقت تک قائم رکھا، جب تک ان کی طرف سے کھلی ہوئی بدعہدی اور وعدہ خلافی کی نوبت نہیں آگئی۔

غرض کہ کم سے کم یہ تین مثالیں رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ایک ایسے معاشرہ کی ملتی ہیں، جس میں مختلف مذاہب کے لوگوں کو اپنے مذہب پر عمل کرتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا موقع فراہم کیا گیا، ان میں سے خاص کر مکہ اور حبشہ کی مثالیں مسلمان اقلیت کے اکثریت کے ساتھ تعلقات کی بنیاد فراہم کرتی ہیں، پھر اس تکثیری معاشرہ کے تصور کو آگے بڑھاتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق مقرر فرمائے اور انھیں نہ صرف جان و مال، عزت و آبرو، معاشی جدوجہد وغیرہ میں آزادی عطا کی؛ بلکہ انھیں اپنے مذہب پر عمل کرنے کا بھی پورا پورا حق دیا گیا، یہ اس طریقۂ عمل کے بالکل برعکس تھا، جو اس زمانہ کی حکومتوں میں مروج تھا اور جس میں مذہبی اقلیتوں کو کوئی حق حاصل نہیں ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں جتنی مسلم حکومتیں قائم ہوئیں، ان کے زیر سایہ مختلف مذاہب پر یقین رکھنے والے لوگوں نے امن وسکون کے ساتھ زندگی بسر کی اور اس حکومت کو اپنے لئے سایۂ رحمت سمجھا، شام سے لے کر اسپین تک ہر جگہ عیسائیوں کو پوری آزادی دی گئی، ہندوستان میں ہندو بھائیوں کے حقوق اور خاص کر

ان کی مذہبی آزادی کا پورا پاس ولحاظ رکھا گیا، یہود جب عالم عیسائیت کے ظلم وجور کا نشانہ تھے اورانھیں مختلف علاقوں میں مارے مارے پھرنا پڑتا تھا، اس وقت ان کے لئے سب سے محفوظ پناہ گاہ عالم اسلام ہی تھی، جہاں وہ اپنے تمام تشخصات کے ساتھ باعزت طور پر زندگی گذارتے تھے؛ اس لئے شریعتِ اسلامی میں مسلمانوں کے لئے بہ حیثیت اقلیت برادرانِ وطن کے ساتھ زندگی گزارنے کے اُصول کی رہنمائی بھی ہے اور ایک ایسے کثیر مذہبی سماج کا تصور بھی، جس میں مسلمانوں کے زیر اقتدار غیر مسلم حضرات پوری آزادی، انسانی حقوق اور عزت نفس کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں۔

پوری انسانیت--ایک کنبہ

اس سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق پوری انسانیت کا آغاز ایک ہی ہستی کے وجود سے ہوا ہے، خدا نے اسی ہستی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور اس جوڑے سے پوری انسانیت وجود پذیر ہوئی :

> یٰاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ خَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَ بَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَاءً ا (النساء:۱)
>
> اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا ہے، نیز ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت کو وجود بخشا۔

اس طرح اسلام کی نظر میں پوری انسانیت ایک ہی کنبہ اور خاندان ہے، یہ ایک ہی درخت کی شاخیں اور ایک ہی گلدستہ کے پھول ہیں، اس سے ہمیں انسانی اُخوت کا سبق ملتا ہے، جیسے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، اسی طرح ہر انسان، انسانی رشتہ سے ہمارا بھائی اور ہمارے وسیع تر خاندان اور کنبہ کا ایک حصہ ہے، یہ اُخوت و بھائی چارگی ہمیں محبت و پیار کا

پیغام دیتی ہے اور اس جانب متوجہ کرتی ہے کہ ہمیں ہر فرد و بشر سے محبت ہونی چاہئے۔

شرافتِ انسانی کا تصور

باہمی انسانی روابط کی دوسری بنیاد انسانی شرافت و کرامت اور احترامِ آدمیت ہے، انسان کو بحیثیتِ انسان اللہ تعالیٰ نے قابل احترام قرار دیا ہے :

وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ اٰدَمَ (بنی اسرائیل:۷۰)۔

ہم نے انسان کو معزز بنایا ہے۔

اس کے جسمانی سانچہ کو بہترین سانچہ قرار دیا ہے :

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (التین:۴)۔

ہم نے انسان کو بہترین قالب میں پیدا کیا ہے۔

یہ تکریم و احترام تمام بنی نوعِ انسانی سے متعلق ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے عملی طور پر اس حقیقت کو واضح فرمایا، ایک بار ایک یہودی کا جنازہ جا رہا تھا، آپ ﷺ کھڑے ہو گئے، لوگوں نے عرض کیا کہ یہ یہودی کا جنازہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جان تو اس میں بھی ہے (بخاری، حدیث نمبر:۱۳۱۲، باب من قام بجنازة يهودی)، غزوۂ احزاب کے موقع سے ایک مشرک مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا، اہل مکہ نے خواہش کی کہ اس کی قیمت لے کر نعش ان کے حوالہ کر دیں، تو آپ ﷺ نے کوئی قیمت لئے بغیر نعش واپس کر دی؛ کیوں کہ انسانی نعش کی قیمت وصول کرنا انسانی احترام کے مغائر ہے، اسلام سے پہلے جنگ کا کوئی قانون نہیں تھا اور لوگ مقتول کے اعضاء تراش کر ہار پہنتے اور اپنی آتش انتقام بجھاتے تھے، اسلام نے ایک تو حتی المقدور جنگ سے بچنے کا حکم دیا؛ لیکن اگر اس کی نوبت آ ہی جائے تو جنگ کے مہذب قوانین مقرر کئے، من جملہ ان کے یہ ہے کہ اگر کوئی شخص گرفت میں آ جائے تو ایذاء پہنچا پہنچا کر قتل نہ کیا جائے اور جو مارے جائیں، ان کے اعضاء کاٹے نہ جائیں کہ یہ احترامِ انسانیت کے خلاف ہے۔

اسلام بحیثیتِ انسان کسی غیر مسلم کی توہین وتحقیر کو بھی رَوا نہیں رکھتا،بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ غیر مسلم کے لئے'' کافر'' اور'' ذمی'' کا لفظ استعمال کر کے ان کی تحقیر کی گئی ہے، اسی طرح آج کل بعض غیر مسلم بھائی'' کافر'' کے لفظ کو اہانت آمیز اور حقارت انگیز خیال کرتے ہیں، یہ محض غلط فہمی اور پروپیگنڈہ ہے،'' کفر'' کے معنی انکار کے ہیں،قرآن مجید میں یہ لفظ انکار ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے؛ چنانچہ منکرین آخرت کے بارے میں ارشاد ہوا:'' وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كَافِرُوْنَ ''(یوسف:۳۷)اہل مکہ کو ان باتوں سے انکار تھا،جس کی دعوت رسول اللہ ﷺ دیا کرتے تھے؛اس لیے وہ کہتے تھے:''اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كَافِرُوْنَ ''(الزخرف:۲۴)یعنی: '' آپ جس دین کو لے کر بھیجے گئے، ہیں ہم اس کا انکار کرتے ہیں''اسی طرح جادو کے انکار پر بھی کفر کا اطلاق کیا گیا ہے؛چنانچہ بعض انبیاء علیہم السلام کے مخالفین کا قول نقل کیا ہے:''قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّ اِنَّا بِهٖ كَافِرُوْنَ ''۔(الزخرف:۳۰)

پس'' کافر'' کے معنی انکار کرنے والے،یعنی ایسے شخص کے ہیں، جو توحید اور اسلامی تعلیمات کو قبول نہیں کرتا ہو، گویا یہ غیر مسلم "Non Muslim" کا ہم معنی لفظ ہے، پس یہ ایک حقیقت کا اظہار ہے نہ کہ کسی شخص کی توہین،اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں متعدد مواقع پر اس عہد کے غیر مسلموں کو'' کافر'' کے لفظ سے مخاطب کیا گیا؛لیکن انھوں نے اس کا برا نہیں مانا، اگر یہ لفظ اہانت آمیز ہوتا تو یقیناً انھوں نے اس طرزِ تخاطب پر اعتراض کیا ہوتا، پھر باوجودیکہ یہ لفظ اہانت آمیز نہیں ہے،فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی کو'' اے کافر'' کہنے سے ایذاء ہوتی ہو، تو اس شخص کو اس طرح خطاب نہ کیا جائے اور اگر کرے گا،تو گنہگار ہوگا :

> **ولو قال لذمي : يا كافر ! يأثم ان شق عليه** (الأشباه والنظائر:۲/۲۵۷)۔
> اگر کسی نے کسی ذمی کو اے کافر کہہ کر پکارا اور اس پر یہ گراں گذرتا ہو تو اے کافر کہنے والا شخص گناہ گار ہوگا۔

'ذمی' کا لفظ اہانت نہیں

اسی طرح عربی زبان میں ''ذمۃ'' کے معنی ''عہد'' کے ہیں ''ذمی'' اس شخص کو کہا جاتا ہے، جس کی حفاظت کا عہد کیا جائے؛ چنانچہ عربی زبان کی مشہور لغت ''لسان العرب'' میں ہے :

رجل ذمی، معناہ: له عهد (لسان العرب:۵/۵۹)۔

مردِ ذمی کے معنی ایسے شخص کے ہیں، جس کے لئے عہد کیا گیا ہو۔

اسی طرح علامہ ابن اثیرؒ اس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ غیر مسلم اقلیت کو اہل ذمہ کیوں کہا جاتا ہے؟ رقمطراز ہیں :

سمی أهل الذمة لدخولهم فی عهد المسلمین وأمانهم (النهایة: ۲/۱۶۸)۔

اہل ذمہ اس لئے نام رکھا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے عہد اور ان کی امان میں داخل ہو جاتے ہیں۔

اس لئے یہ محض غلط فہمی ہے کہ قرآن مجید اور حدیثِ نبوی ﷺ میں غیر مسلموں کے لئے اہانت آمیز تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

جہاں تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی روابط کی بات ہے تو اس موضوع کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: سماجی تعلقات، معاشی تعلقات، سیاسی تعلقات اور مذہبی تعلقات ،تعلقات کے ان تمام دائروں کے سلسلے میں قرآن وحدیث سے ہمیں تفصیلی رہنمائی ملتی ہے:

سماجی تعلقات

سماجی تعلقات کے سلسلہ میں بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے :

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ

مِنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ ، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (الممتحنة:۸)۔

جولوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کرتے اور نہ انھوں نے تم کو تمہارے گھر سے نکالا ہے، اللہ تعالیٰ تم کو ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور انصاف برتنے سے نہیں روکتے ، بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک

یہ آیت بنیادی اہمیت کی حامل ہے اور اس سے یہ بات واضح ہے کہ جو غیر مسلم مسلمانوں سے برسر پیکار نہ ہوں، مسلمانوں پر ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرنا ضروری ہے، قرآن نے صاف کہا ہے کہ کسی قوم کا ہدایت کے راستہ پر آنا اور دین حق کو قبول کرنا اللہ تعالیٰ کی توفیق پر منحصر ہے؛ لیکن اس کی وجہ سے کسی گروہ کے ساتھ بے تعلقی کا معاملہ کرنا اور حسن سلوک سے رُک جانا درست نہیں، مسلمان ان کے ساتھ جو بہتر سلوک کریں گے، انھیں بہر حال اس کا اجر مل کر رہے گا :

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَاءُ ، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ، وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ ، وَ مَاتُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (البقرۃ:۲۷۲)۔

ان لوگوں کی ہدایت آپ کے ذمہ نہیں ہے، اللہ جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور تم جو کچھ مال خرچ کرتے ہو، وہ اپنے ہی لئے اور خرچ نہیں کرتے ہو مگر اللہ کی خوشنودی کی تلاش میں اور جو بھی خرچ کروگے تم کو پورا پورا دیا جائے گا، (یعنی اس کا اجر ملے گا) اور تم پر ظلم نہیں ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بعض انصار کی بنو قریظہ

اور بنونضیر کے یہودیوں سے قرابت تھی، انصار ان پر اس لئے صدقہ نہیں کیا کرتے تھے کہ جب ضرورت مند ہوں گے تو اسلام قبول کریں گے (تفسیر قرطبی: ۳/ ۳۳۷)، اللہ تعالیٰ نے ان کے اس رویہ کو پسند نہیں کیا اور فرمایا: ان کی ہدایت کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے؛ لیکن تم کو اس کی وجہ سے اپنا دستِ تعاون نہ کھینچنا چاہئے؛ کیوں کہ تم کو تمہارے انفاق کا اجر مل کر رہے گا۔

رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقاء رضی اللہ عنہم نے عملی طور پر اس کو برت کر دکھایا، مکہ میں شدید قحط پڑا، لوگ مردار وغیرہ کھانے پر مجبور ہو گئے، یہ زمانہ مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان شدید اختلاف اور گرما گرمی کا تھا، اس کے باوجود آپ ﷺ نے مکہ کے قحط زدہ مشرکین کے لئے پانچ سو دینار بھیجے؛ حالاں کہ اس وقت خود مدینہ کے مسلمان سخت مالی دقتوں اور فاقہ مستیوں سے دوچار تھے، نیز آپ ﷺ نے یہ رقم سردارانِ قریش ابوسفیان اور صفوان بن اُمیہ کو بھیجی، جو مسلمانوں کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور مشرکین مکہ کی قیادت کر رہے تھے (ردالمحتار: ۳/ ۳۰۲، باب المصرف)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بوڑھے غیر مسلم کو دیکھا کہ وہ بھیک مانگ رہا ہے، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وجہ پوچھی تو کہا کہ ہمیں جزیہ ادا کرنا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر فرمایا اور کہا ہم نے تمہاری جوانی کو کھایا اور اب پھر تم سے جزیہ وصول کریں، یہ انصاف کی بات نہیں ہے: ''ما أنصفناک أکلنا شبیتک ، ثم نأخذ منک الجزیة'' (نصب الرایۃ: ۳/ ۴۵۴) چنانچہ فقہاء کے یہاں اس پر تو قریب قریب اتفاق ہے کہ صدقاتِ نافلہ غیر مسلموں کو دیا جاسکتا ہے، حنفیہ کے نزدیک راجح یہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے صدقاتِ واجبہ بھی غیر مسلموں کو دیئے جاسکتے ہیں (دیکھئے الدر المختار علی ہامش ردالمحتار: ۳/ ۳۰۱)۔

انسانی زندگی کا احترام وتحفظ

سماجی زندگی میں سب سے اہم مسئلہ امن وامان کا ہے اور امن وامان کا تعلق جان ومال اور عزت وآبرو سے ہے؛ چنانچہ شریعتِ اسلامی میں غیر مسلموں کی جان ومال اور عزت وآبرو کو

وہی اہمیت دی گئی ہے، جو مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کو دی گئی ہے، اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے یہ اُصولی بات ارشاد فرمائی ہے کہ ان کے خون ہمارے خون کی طرح اور ان کے مال ہمارے مال کی طرح ہیں :

دِمَائُھُمْ کَدِمَائِنَا ، وَ أَمْوَالُھُمْ کَأَمْوَالِنَا (نصب الرایۃ: ۳۶۹/۴)۔

چنانچہ قرآن مجید نے مطلق نفس انسانی کے قتل سے منع کیا ہے، ارشاد ہے :

لَا تَقْتُلُوْا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ (بنی اسرائیل: ۳۳)۔

کسی نفس کو جس کے قتل کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے، ناحق قتل نہ کرو۔

ایک اور موقع پر کسی معقول سبب کے بغیر ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا گیا:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا (المائدۃ: ۳۲)۔

جس نے کسی نفس انسانی کو کسی دوسرے کے بدلے یا زمین میں فساد کے بغیر قتل کیا تو گویا اس نے پوری انسانیت کو قتل کر دیا۔

کیوں کہ اگر کوئی شخص ایک بے قصور شخص کو قتل کر سکتا ہے تو وہ انسانیت کے کسی بھی شخص کو قتل و غارت گری کا نشانہ بنا سکتا ہے؛ اس لئے گویا وہ پوری انسانیت کا قاتل ہے، ان آیات میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی قید نہیں ہے؛ بلکہ مطلقاً کسی بھی انسان کے قتل کو منع فرمایا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ہیں غیر مسلم ـــ جس سے امن اور بقاءِ باہم کا معاہدہ ہو ـــ کے قاتل کے بارے میں فرمایا، کہ وہ جنت کی بو سے بھی محروم رہے گا :

مَنْ قَتَلَ مُعَاھِدًا لَمْ یَرِحْ رَائِحَۃَ الْجَنَّۃِ ، وَ اِنَّ رِیْحَھَا یُوْجَدُ مِنْ مَسِیْرَۃِ أَرْبَعِیْنَ عَامًا (بخاری عن عبداللہ بن عمرؓ ، حدیث نمبر : ۳۱۶۶)۔

جس نے کسی معاہد (وہ غیر مسلم جس سے پُر امن زندگی گزارنے کا معاہدہ

ہو) کو قتل کیا، وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا؛ حالاں کہ اس کی بو چالیس سال کے فاصلہ سے محسوس کی جاسکتی ہے۔

اگر کوئی مسلمان غیر مسلم کو قتل کردے تو مسلمانوں کو بھی اس کے قصاص میں قتل کردیا جائے گا؛ کیوں کہ قرآن مجید نے علی الاطلاق قصاص کا یہی اُصول بتلایا ہے، جو شخص دوسرے شخص کا قاتل ہو، وہ اس کے بدلے قتل کیا جائے گا: ''اَلنَّفْسُ بِالنَّفْسِ'' (المائدہ:۴۵) اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں ایک غیر مسلم (ذمی) کے قصاص میں ایک مسلمان کو قتل کیا گیا (مصنف عبد الرزاق: ۱۰/۱۰۱)، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے ''ذمی'' کے بدلے مسلمان کے قتل کا حکم دیا (مصنف عبد الرزاق: ۱۰/۱۰۱)، امام شافعیؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کیا ہے کہ انھوں نے بعض اہل ذمہ کو قتل کرنے والے مسلمانوں کو قتل کرنے کا حکم فرمایا (مسندِ امام شافعی، السنن البیہقی: ۱۲/۴۳)۔

اگر مقتول کے ورثاء سزاءِ قید کو معاف کردیں، یا قتل کے واقعہ میں قصد وارادہ کو دخل نہ ہو؛ بلکہ غلطی سے قتل کا ارتکاب ہوا ہو تو ان صورتوں میں قصاص کے بدلہ خون بہا (دیت) واجب ہوتا ہے؛ چنانچہ خون بہا بھی مسلمان اور غیر مسلم کا یکساں ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے غیر مسلم کی دیت مسلمان ہی کی طرح ادا کی (دیکھئے: نصب الرایہ: ۴/۳۶۸-۳۶۹) حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابو ہریرہ، حضرت اسامہ بن زید اور مختلف صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم کی دیت برابر ہوگی، علامہ زیلعیؒ نے تفصیل سے ان روایتوں کو نقل فرمایا ہے (سنن دار قطنی، کتاب الحدود)۔

املاک کا احترام

رسول اللہ ﷺ نے جو اُصول مقرر فرمایا کہ غیر مسلموں کی جانیں مسلمانوں کے جانوں کی طرح ہیں اور ان کے مال مسلمانوں کے مالوں کی طرح ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کی

املاک بھی اسی طرح قابل احترام ہیں جیسا کہ مسلمانوں کی، بغیر رضامندی کے نہ کسی مسلمان کا مال لیا جاسکتا ہے نہ کسی غیر مسلم کا: ''اِلَّا اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ'' (النساء:۲۹)۔

فتح خیبر کے موقع سے بعض مسلمان فوجیوں نے یہودیوں کے جانور ذبح کردیئے اور کچھ پھل کھالئے، رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے اس موقع پر خطاب کیا، اس عمل پر ناگواری ظاہر کی اور فرمایا کہ یہ تمہارے لئے حلال نہیں ہے (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۰۵۰)۔

متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے آپ ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے :

أَلَا مَنْ ظَلَمَ مُعَاهِدًا أَوْ انْتَقَصَهُ أَوْ كَلَّفَهُ فَوْقَ طَاقَتِهِ أَوْ أَخَذَ مِنْهُ شَيْئًا بِغَيْرِ طِيبِ نَفْسٍ ، فَأَنَا حَجِيجُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

(ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۰۵۳)۔

آگاہ ہوجاؤ! جس نے کسی معاہد پر ظلم کیا، اس کی حق تلفی کی یا اسے اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلّف کیا یا اس سے کوئی چیز اس کی رضامندی کے بغیر لے لی، تو میں قیامت کے دن اس کا فریق ہوں گا۔

اسلامی قانون کی رو سے چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، جیسے مسلمان کا مال چوری کرنے میں ہاتھ کاٹا جائے گا، اسی طرح اگر کوئی مسلمان چور غیر مسلم کا مال چوری کرلے تو اس صورت میں بھی اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، علامہ ابن قدامہ مقدسیؒ نے یہ لکھتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ یہ مسئلہ فقہاء کے یہاں متفق علیہ ہے (المغنی لابن قدامہ: ۱۲/۴۵۱، مع تحقیق: عبداللہ بن عبدالمحسن وغیرہ) اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر میں مسلمان اور غیر مسلم کی ملکیت یکساں قابل احترام ہے۔

عزت وآبرو کی حفاظت

یہی معاملہ عزت و آبرو اور عفت وعصمت کی حفاظت کا ہے، رسول اللہ ﷺ نے بلاتفریقِ مذہب ہر بڑے کی توقیر کا حکم دیا ہے اور ہر چھوٹے پر شفقت اور محبت کی تلقین کی ہے،

مؤمنوں سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

يَـا أَيُّهَـا الَّـذِيْنَ آمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسٰى أَن يَكُوْنُوْا خَيْراً مِّـنْهُـمْ وَلَا نِسَـاءٌ مِّـن نِّسَاءٍ عَسٰى أَن يَكُنَّ خَيْراً مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْأَلْقَابِ (الحجرات:۱۱)۔

اے ایمان والو! ایک گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اُڑائے ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہو اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا تمسخر کریں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہو، نہ ایک دوسرے پر طعن کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب دو۔

اسی طرح مردوں سے فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنی نگاہوں اور شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور یہی حکم مسلمان عورتوں کو بھی دیا گیا، (النور:۳۱) یہ حکم مطلق ہے اور اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی تفریق نہیں، معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کی عزت و آبرو کی بھی وہی اہمیت ہے، جو مسلمانوں کی ہے، عفت و عصمت کو مجروح کرنے والی چیزیں حرام ہیں، خواہ مسلمانوں کے ساتھ کی جائیں یا غیر مسلموں کے ساتھ، مطلقاً حرام ہیں، جو سزا کسی مسلمان عورت کی آبروریزی کی ہے، وہی سزا غیر مسلم عورت کی آبروریزی کی بھی ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ عزت و آبرو کے اعتبار سے غیر مسلم بھائیوں کو وہی درجہ حاصل ہے، جو مسلمانوں کو حاصل ہے۔

خوشی وغم میں شرکت

سماجی تعلقات کے دائرہ میں کھانا، کھلانا، پڑھنا، پڑھانا، باہمی ملاقات، خوشی وغم کے موقع پر دلداری وغیرہ اُمور بھی آتے ہیں، اسلام نے ان تمام شعبوں میں غیر مسلموں کے ساتھ بھی خوش گوار برتاؤ کا حکم دیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلموں کی دعوت قبول فرمائی ہے (صحیح بخاری، حدیث نمبر ۲۶۱۷، باب قبول الہدیۃ من المشرکین) خود غیر مسلموں کو دعوت دی ہے (الدر المنثور: ۱۸۱/۵) انھیں اپنا مہمان بنایا ہے (الخصائص الکبریٰ: ۱/ ۱۲۳) اپنے رفقاء کو غیر مسلم بزرگوں کی تجہیز و

تکفین کے انتظام کا حکم دیا ہے (اعلاء السنن: ۸/ ۲۸۲، باب مایفعل المسلم اذا مات لہ قریب کافر) نیز غیر مسلموں کی عیادت کی ہے (صحیح البخاری، حدیث نمبر ۵۶۵۷، باب عیادۃ المشرک)۔

رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں فقہاء نے غیر مسلموں سے متعلق جو احکام دیئے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں :

- مجوسی کا ہر قسم کا کھانا جائز ہے، سوائے ذبیحہ کے۔
- مسلمان اور مشرک رشتہ دار کے ساتھ صلہ رحمی کرنا درست ہے، وہ نزدیک کا ہو یا دور کا اور ذمی ہو یا حربی، حربی سے مراد وہ شخص ہے، جو دشمن ملک کا شہری ہو۔
- مسلمانوں کے لئے عیسائی پڑوسی سے مصافحہ کرنا درست ہے۔
- یہودی اور عیسائی کی عیادت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔
- جب کسی غیر مسلم کی وفات ہو جائے تو اس کے عزیز سے عیادت کے لئے یہ الفاظ کہے جائیں :

اَخْلَفَ اللّٰہُ خَیْرًا مِّنْہُ وَ أَصْلَحَکَ (ہندیۃ: ۵/ ۳۸۴)

اللہ تجھ کو اس کا نعم البدل عطا فرمائے اور تمہاری حالت کو بہتر کرے۔

تعلیم وتعلم کا تعلق

غیر مسلموں سے تعلیم وتعلّم بھی درست ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''علم وحکمت مؤمن کی متاعِ گم شدہ ہے: ''اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ'' (ترمذی، عن ابی ہریرۃؓ، حدیث نمبر: ۲۶۸۷) چنانچہ جنگِ بدر کے قیدیوں میں جو لوگ پڑھنے لکھنے سے واقف تھے، آپ ﷺ نے ان کا فدیہ یہی مقرر کیا تھا کہ وہ دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں، اسی لئے تعلیم وتعلّم کے مقدس رشتہ میں مذہب کی بنیاد پر کوئی تفریق رَوا نہیں رکھی گئی ہے۔

البتہ سماجی تعلقات میں اس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اسلام نے وضع قطع، رسم

ورواج وغیرہ میں اس بات کو پسند کیا ہے کہ مسلمان اپنی شناخت کو باقی رکھیں اور اپنے تہذیبی تشخص کو کھو نہیں دیں؛ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ :

لَیسَ مِنَّا مَنْ تَشَبَّهَ بِغَیْرِنَا (الجامع للترمذی، حدیث نمبر: ۲۶۹۵)۔

جو دوسروں کی مماثلت اور مشابہت اختیار کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اسی لئے آپ ﷺ نے سلام کے طریقہ، داڑھی اور سر کے بال کی وضع وغیرہ میں اس بات کو پسند نہیں کیا ہے کہ مسلمان اپنے امتیاز کو کھو دیں۔

معاشی تعلقات

معاشی تعلقات کے معاملہ میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی تفریق نہیں، نبوت کے بعد بھی رسول اللہ ﷺ کا ابوسفیان اور جبیر بن مطعم کے ساتھ مضاربت کرنا منقول ہے، اسی طرح خیبر کے فتح ہونے کے بعد آپ ﷺ نے وہاں کی اراضی یہودیوں کے قبضہ میں ہی رہنے دیں اور ان سے بٹائی پر معاملہ طے کرلیا، جس کا بخاری اور مختلف کتبِ احادیث میں ذکر موجود ہے (صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۴۲۴۸، باب معاملۃ النبی اھل خیبر) مسلمانوں کے لئے یہ بات درست ہے کہ وہ کسی غیر مسلم کے یہاں ملازمت کریں؛ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی کے یہاں مزدوری کی ہے، کتبِ احادیث میں اس کا ذکر موجود ہے (کنز العمال: ۳۲۱/۲) حضرت خباب رضی اللہ عنہ لوہاری کے فن سے واقف تھے، انھوں نے عاص بن وائل کے لئے کام کیا، اس کا ذکر بھی احادیث میں موجود ہے: ''خباب قال کنت رجلاً قیناً فعملت للعاص بن وائل'' (بخاری، حدیث نمبر: ۲۲۷۵، مسلم، حدیث نمبر: ۷۰۶۲)۔

اسی طرح یہ بات بھی درست ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کو اپنے یہاں ملازمت کا موقع دیں، عرب میں سڑکوں کا کوئی باضابطہ نظام نہیں تھا اور پورا خطۂ عرب ریت سے ڈھکا ہوا تھا، اسی لئے راستہ کی شناخت دشوار ہوتی تھی اور جن لوگوں کو شناخت نہیں ہوتی تھی، وہ سفر میں کسی راہ بتانے

والے کو ساتھ لے جاتے تھے، ان کو ''دلیل'' کہا جاتا تھا، جس کے معنی راہبر کے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے جب مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو ایک مشرک کو اپنے لئے بطورِ 'دلیل' اُجرت دے کر ساتھ رکھا (احکام أہل الذمۃ لابن قیم: ۲۰۷)، اسی لئے فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمان غیر مسلم کو اپنے یہاں ملازم رکھ سکتے ہیں: ''یجوز أن یکون الأجیر ذمیا والمستأجر مسلما بلاخوف'' (الموسوعۃ الفقہیۃ: ۱۰۵، مادہ: اجارہ)۔

چنانچہ مسلم عہدِ حکومت میں غیر مسلم حضرات بڑے اونچے اور کلیدی عہدوں پر فائز رہے ہیں، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں حمص کا فینانشیل کمشنر اور حاکم ابن اُثال نامی ایک عیسائی تھا، عبدالملک بن مروان کا کاتب ابن سرجون تھا، یہ بھی عیسائی تھا، کاتب کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اسی سے فرامین سلطنت کی مراسلت متعلق تھی اور بقول علامہ شبلیؒ وہ وزیر اعظم کے برابر یا اس سے دوسرے درجہ پر خیال کیا جاتا تھا، عباسی دور میں ابواسحاق صابی اس منصب پر فائز تھا، سلطنت ویلم کے تاجدار عضد الدولہ جیسے عظیم فرمانروا کا وزیر اعظم بھی ایک عیسائی تھا، جس کا نام نصر بن ہارون تھا، یہ تمام فرمانروا نہ صرف اپنی طاقت وحکمرانی میں ممتاز تھے؛ بلکہ مذہب سے بھی ان کا خاص تعلق تھا؛ لیکن ان کی مذہبیت غیر مسلم بھائیوں سے سلطنت کے اہم اور کلیدی شعبوں میں خدمت لینے میں حارج نہیں ہوئی (تفصیل کے لئے دیکھئے: مقالاتِ شبلی: ۲/ ۲۱۷-۲۱۹)۔

سیاسی تعلقات

انسان جس خطہ میں رہتا ہو، وہاں کے سیاسی حالات سے بے تعلق نہیں رہ سکتا؛ کیوں کہ سیاسی مد وجزر اور اتار چڑھاؤ کا اثر زندگی کے تمام شعبوں پر پڑتا ہے اور بڑی حد تک سماج کا امن وامان بھی ان حالات سے متعلق ہوتا ہے؛ چنانچہ اسلام میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی روابط کی گنجائش رکھی گئی ہے، سیاست کا مقصد ملک میں قانون کی حکمرانی کو قائم رکھنا اور مستحکم

بنانا ہے، رسول اللہ ﷺ جب اس دنیا میں تشریف لائے، اس وقت حجاز کے علاقہ میں کوئی باضابطہ حکومت موجود نہیں تھی؛ البتہ قبائلی روایات اور دستور کے مطابق تحفظ ہوا کرتا تھا اور لوگوں کے باہمی تعلقات قائم رہتے تھے۔

سیاسی اشتراک

اسی زمانہ میں مکہ میں ایک واقعہ پیش آیا کہ مکہ کے ایک شخص نے ایک بیرونی شخص کا حق ادا کرنے سے انکار کردیا؛ چوں کہ اس کا تعلق مکہ سے نہیں تھا اور مکہ میں اس کے ہم قبیلہ لوگ بھی نہیں تھے، اس لئے ممکن نہ تھا کہ وہ بزورِ طاقت اپنا حق حاصل کرسکے، اس غریب الوطن شخص نے صحن کعبہ میں اہل مکہ کو اپنی بپتا سنائی اور ان کے ضمیر سے انصاف کا طلب گار رہوا، اس موقع سے کچھ لوگ اس کی مدد کے لئے کھڑے ہوئے اور عبداللہ بن جدعان کے مکان پر اس کی نشست ہوئی، اس میں آپ ﷺ نے بھی پوری سرگرمی سے شرکت کی اور اس طرح ''حلف الفضول'' نامی ایک تنظیم قائم ہوئی، جس کا مقصد انصاف کو قائم کرنا، ظلم کو روکنا اور ظالم کے خلاف مزاحمت کرنا تھا، یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا تھا؛ لیکن رسول اللہ ﷺ کو یہ کام اس قدر پسند آیا تھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر مجھے آج بھی اس کی طرف بلایا گیا تو میں اس پر لبیک کہوں گا: ''لَوْ اُدْعِی بِہٖ فِی الإِسْلَامِ لَأَجَبْتُ'' (البدایۃ والنہایۃ: ۲/۲۹۱)۔

بنو امیہ کے دور میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کے درمیان ایک مسئلہ پر نزاع پیدا ہوگئی، جس میں ولید کی زیادتی تھی، حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ولید بن عتبہ بن ابی سفیان میں ولید کی زیادتی تھی، حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں اسی حوالہ سے لوگوں کی مدد چاہی، یکے بعد دیگرے کئی صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس پر لبیک کہا، بالآخر ولید کو اپنے ارادہ سے باز آنا پڑا (سیرت ابن ہشام: ۱/۳۵۱) یہ واقعہ اس بات کے لئے بنیاد فراہم کرتا ہے کہ سیاسی جدوجہد میں مسلمان اور غیر مسلم ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک کرسکتے ہیں اور سیاسی تعلقات میں اُصولوں کی بنیاد پر

غیر مسلموں کا تعاون کیا جاسکتا اور ان سے تعاون لیا جاسکتا ہے، نیز ایسی سیاسی تنظیموں میں جو خالص مسلم تنظیم نہ ہو، مسلمان شریک ہوسکتے ہیں۔

قرآن مجید نے حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ تفصیل سے ذکر کیا ہے، مصر میں اس وقت مشرکین ہی کی حکومت تھی، حضرت یوسف علیہ السلام نے ملکی مفادات اور مصالح کو سامنے رکھتے ہوئے وزارتِ خزانہ طلب فرمائی: ''قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَائِنِ الْاَرْضِ'' (یوسف:۵۵) حضرت یوسف علیہ السلام کی خواہش قبول کی گئی اور انھوں نے اس فریضہ کو بہت ہی خوش اُسلوبی کے ساتھ انجام دیا، اس سے معلوم ہوا کہ ایسے اقتدار میں شریک وسہیم ہونا بھی درست ہے، جس میں غیر مسلموں کو غلبہ حاصل ہو۔

مبنی برانصاف قوانین کی اطاعت

غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے سیاسی تعلقات دو اصولوں پر مبنی ہوں گے، اوّل ان قوانین کی اطاعت پر، جو مبنی برانصاف ہوں؛ کیوں کہ آپ جب کسی ملک کی شہریت قبول کرتے ہیں، تو یہ زبانِ حال سے اس ملک کے دستور کی پاسداری اور فرمانبرداری کا اقرار ہے اور ایک طرح کا عہد ہے، جو ہم نے اس ملک کے ساتھ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ عہد کو پورا کرو: ''اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ'' (المائدۃ:۱) ایک اور موقع پر فرمایا گیا: ''اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ'' (الاسراء:۳۴) یعنی معاہدات اور وعدوں کی پاسداری کرو، قانون شکنی کو اسلام جائز نہیں قرار دیتا؛ بشرطیکہ وہ صریحاً عدل کے خلاف نہ ہوں۔

یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ اسلام میں معاہدات کو ایسی اہمیت حاصل ہے کہ ان کی وجہ سے بعض عمومی قوانین میں استثنائی صورت اختیار کی جاتی ہے؛ چنانچہ قرآن مجید کا یہ ارشاد قابل توجہ ہے :

إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِیْ

سَبِيْلِ اللهِ ، وَالَّذِيْنَ آوَوْا وَّنَصَرُوْا أُوْلٰئِکَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءَ بَعْضٍ ، وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَالَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْئٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ، وَإِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلاَّ عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ (الانفال:۷۲)۔

جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور اپنے مال کھپائے اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی، وہی دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں، رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے (دارالاسلام میں) آنہیں گئے تو ان سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں، ہاں اگر وہ دین کے معاملہ تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے؛ لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے غیر مسلم اکثریت کے ساتھ زندگی گزارنے والے مسلمانوں کی مدد کے بارے میں فرمایا ہے کہ بشرطیکہ تمہارے درمیان اور ان کے درمیان پہلے سے کوئی معاہدہ موجود نہ ہو ،خود رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں ، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ’’مسلمانوں کی شان یہ ہے کہ وہ دوسرے مسلمان پر ظلم بھی نہ کریں اور اسے ظلم ہوتا ہوا چھوڑے بھی نہیں‘‘---لیکن صلح حدیبیہ کے موقع سے جب حضرت ابو جندل ؓ پابہ زنجیر خون میں لہولہان ہو کر آئے اور مسلمانوں سے التجاء کی کہ وہ انھیں اپنے ساتھ مدینہ لے چلیں اور حضور ﷺ کی خواہش بلکہ اپیل کے باوجود اہل مکہ اس کے لئے تیار نہیں ہوئے تو آپ نے انھیں ساتھ لینے پر اصرار نہیں فرمایا اور تلقین کی کہ صبر کرو، اللہ تمہارے لئے کوئی راستہ نکالیں گے، غرض کہ حضرت ابو جندل ؓ کی گزارش اور اس آزمائش کے مقابلہ آپ نے طے شدہ معاہدہ پر عمل کرنے کو ترجیح دی۔

اسی طرح غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے پاس فوجیوں کی تعداد کم تھی اور ایک ایک فوجی کی اہمیت تھی، اسی درمیان حضرت حذیفہ بن یمان اور ان کے والد اہل مکہ کی فوج کی جانب سے آئے، اہل مکہ نے انھیں گرفتار کرلیا اور اس شرط پر چھوڑا کہ وہ جہاد میں مسلمانوں کے ساتھ شریک نہ ہوں، پھر یہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جہاد میں شرکت کے لئے اجازت کے خواستگار ہوئے؛ لیکن رسول اللہ ﷺ نے انھیں یہ کہہ کر شریک جہاد ہونے سے منع فرمایا کہ تم اپنا وعدہ پورا کرو، اللہ ہماری مدد کرے گا — اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ طے پانے والے معاہدات کی کسی قدر اہمیت ہے!

غرض کہ جب ہم کسی ملک کی شہریت قبول کرتے ہیں تو یہ اس ملک کے قوانین کی پابندی کا عہد ہوتا ہے اور دستور کی وساطت سے ہم صرف حکومت ہی کے ساتھ نہیں؛ بلکہ ملک کے تمام شہریوں کے ساتھ بھی ایک معاہدہ میں بندھے ہوتے ہیں، اس لئے ہم پر ملکی قانون کا پاس ولحاظ رکھنا نہ صرف قانوناً واجب ہے؛ بلکہ شرعاً بھی واجب ہے، بشرطیکہ وہ صریح طور پر اسلامی شریعت سے متصادم نہ ہو۔

ظلم کی مخالفت

سیاسی اشتراک کی دوسری بنیاد ظلم کی مخالفت اور اس کے سد باب میں باہمی تعاون ہے، قرآن مجید میں متعدد مقامات پر منکر کو روکنے کا حکم دیا گیا ہے، ''منکر'' میں تمام برائیاں شامل ہیں اور یقیناً ظلم بھی اس میں داخل ہے، رسول اللہ ﷺ نے منکر کو روکنے کے طریقہ کے سلسلہ میں یہ اُصول بتایا کہ اس کے لئے قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے طاقت کا استعمال کرسکتا ہو تو اس کا استعمال کرے، اگر طاقت کا استعمال نہیں کرسکتا تو زبان سے اس کے خلاف احتجاج کرے اور اگر زبان کے استعمال سے بھی عاجز ہے تو دل سے اس کو برا مانے اور عزم رکھے کہ جب بھی ممکن ہوگا، وہ ظلم کو دفع کرنے کی کوشش کرے گا:

مَنْ رَأیٰ مِنکُمْ مُنکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ ، وَ مَنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ، وَ مَنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ ، وَذٰلِکَ أَضْعَفُ الْإِیْمَانِ (مسلم حدیث نمبر: ۴۹)۔

تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے تو چاہئے کہ بزورِ بازو اسے بدلنے کی کوشش کرے، اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے اور اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل سے برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمتر درجہ ہے۔

''ید'' ایک علامتی لفظ ہے اور ہاتھ سے مراد طاقت ہے، اس زمانہ میں ووٹ اور پر امن احتجاج بھی ایک طاقت ہے، اسی طرح زبان سے منکر کو روکنے میں زبان کے ذریعہ ظلم کے خلاف احتجاج بھی شامل ہے؛ اسی لئے قرآن مجید نے بری بات کو زبان پر لانے اور علی الاعلان کہنے کو منع کیا ہے؛ لیکن ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی اجازت دی ہے :

لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (النساء:۱۴۸)۔

اللہ تعالیٰ بری بات کے زور سے کہنے کو پسند نہیں کرتے، سوائے اس کے کہ وہ مظلوم ہو۔

حدیث میں احتجاج کے بعض اور طریقے بھی منقول ہیں (دیکھئے مجمع الزوائد: ۸/۱۲۰، باب ماجاء فی أذی الجاری) ---غرض کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی اشتراک درست ہے،؛ البتہ سیاسی اشتراک خود مسلمانوں کا باہمی طور پر ہو یا مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہو، اس کا مقصد صرف اقتدار میں ساجھے داری نہ ہو؛ بلکہ انصاف کو قائم کرنا اور ظلم کو روکنا مقصود ہو۔

مذہبی تعلقات

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کے سلسلہ میں سب سے اہم موضوع مذہبی تعلقات کا ہے، اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب

کے معاملہ میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں: اپنے دین پر استقامت اور دوسروں کے مذہبی جذبات کا احترام۔

شریعت اسلامی پر عمل

مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں — مسلم ممالک میں یا غیر مسلم ممالک میں — دین کے چار شعبوں میں ان کے لئے قانونِ شریعت کا التزام ضروری ہے، اعتقادات، عبادات، احوالِ شخصیہ اور معاملات۔

اعتقادات سے مراد وہ احکام ہیں، جن کا تعلق قلب وضمیر سے ہو، جیسے توحید، رسالت، آخرت کا یقین وغیرہ۔

''عبادات'' سے وہ احکام مراد ہیں، جن کا تعلق براہِ راست خدا اور بندے کے باہمی ارتباط سے ہے، جیسے: نماز، روزہ وغیرہ۔

''احوالِ شخصیہ'' سے مراد Parasnal Law ہے، اس میں نکاح، طلاق کے علاوہ میراث، وصیت اور مختلف اقارب سے متعلق حقوق وفرائض بھی آجاتے ہیں۔

''معاملات'' سے مراد مالی بنیاد پر دو افراد کے تعلقات ومعاہدات ہیں: تجارت، اجارہ، ہبہ وغیرہ اس شعبہ کے تحت آتے ہیں اور سود وقمار جیسے حرام معاملات بھی اسی دائرہ میں ہیں۔

یہ تمام قوانین وہ ہیں کہ چاہے مسلم اکثریت ملک ہو یا غیر مسلم اکثریت ملک اور کلیدِ اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ ہو یا نہیں ہو، مسلمانوں کے لیے ان قوانین میں شریعتِ اسلامی کی اطاعت واجب ہے، جو قوانین اجتماعی نوعیت کے ہوں، یا جرم وسزا سے متعلق ہوں، جیسے حدود، قصاص، نظامِ مملکت وغیرہ، ان شعبوں سے متعلق شرعی قوانین وہیں قابل نفاذ ہیں، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور باگِ اقتدار ان کے ہاتھوں میں ہو، پس غیر مسلموں سے تعلقات ان قوانین پر عمل آوری کے حق سے دست برداری اور محرومی کی قیمت پر استوار نہیں کئے جاسکتے اور اس سلسلہ

میں کسی تبدیلی کو قبول کرنے کا مطالبہ فی نفسہٖ نامعقول بھی ہے؛ کیوں کہ مسلمانوں کے ان پر عمل کرنے اور نہ کرنے سے غیر مسلم بھائیوں کو نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ کوئی نقصان۔

اپنی شناخت کی حفاظت

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ اسلام مسلمانوں سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے اپنے وجود کو دوسروں کے ساتھ گم نہ کرلیں؛ بلکہ اپنی شناخت اور پہچان کو باقی رکھیں، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے دوسری اقوام کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے :

لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَشَبَّهَ بِغَيْرِنَا ، لَا تُشَبِّهُوْا بِالْيَهُوْدِ وَلَا بِالنَّصَارىٰ الخ (الجامع للترمذی ، حدیث نمبر : ۲۲۹۵، کتاب الاستیذان)۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو دوسروں کی مشابہت اختیار کرے وہ ہم میں سے نہیں، یہودیوں اور عیسائیوں سے مماثلت اختیار نہ کرو۔

اس تشبہ اور مماثلت کے چار مدارج ہو سکتے ہیں :

(الف) دوسری قوموں کے مذہبی شعائر میں مماثلت اختیار کی جائے، جیسے مسلمان صلیب یا زنار پہننے لگیں، یا سکھوں کے جو مخصوص شعائر ہیں، ان کو استعمال کریں---فقہاء نے اسے باعثِ کفر قرار دیا ہے، مجوسی خاص قسم کی ٹوپی پہنا کرتے تھے، فقہاء نے اس پر کفر کا حکم لگایا ہے: ''وَ لَوْ وَضَعَ عَلٰى رَأْسِهٖ قَلَنْسُوَةَ الْمَجُوْسِ كَفَرَ''(الملتقط فی الفتاوی الحنفیة:۲۴۵)۔

اسی طرح فقہاء کے یہاں زنار کے بارے میں بھی صراحت ملتی ہے، ہندوستان میں ''قشقہ'' لگانے کا حکم بھی یہی ہے؛ کیوں کہ وہ ہندو بھائیوں کے مذہبی شعائر میں سے ہے۔

(ب) غیر مسلم مذہبی تہواروں میں شرکت، یہ اگر یوں ہی ہو یا اس کا مقصد اپنے گمان کے مطابق رواداری ہو، تو حرام ہے اور اگر ان کے مذہبی معتقدات اور افعال پر خوشنودی و رضامندی کا

اظہار اور تائید و تحسین مقصود ہو، تو کفر ہے: ''إِنَّمَا الرِّضَا بِالْكُفْرِ مُسْتَحْسِنًا كُفْرٌ'' (الملتقط: ۲۴۵) کیوں کہ آدمی، جس مذہب پر عقیدہ نہ رکھتا ہو اور اپنے عقیدہ کے مطابق اس کو نادرست خیال کرتا ہو، اس میں شرکت اور اس پر رضامندی و خوشنودی کا اظہار کھلی ہوئی دوعملی اور نفاق کی بات ہے؛ اس لئے اسلام نہ مسلمانوں کے لئے اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ ایسا منافقانہ رویہ اختیار کریں اور نہ غیر مسلموں سے خواہش کرتا ہے کہ وہ اسلامی شعائر کو اختیار کریں اور مسلمانوں کے مذہبی تہواروں میں شریک ہوں۔

(ج) تیسرا درجہ تہذیبی تشبہ کا ہے، یعنی ایسی وضع قطع اور لباس، جو کسی خاص قوم کی شناخت بن گئی ہو اور اس کا مذہب سے تعلق نہ ہو، کو اختیار کرنا، جیسے ہندوستان میں ''دھوتی'' کہ اس کا مذہب سے تعلق نہیں؛ لیکن یہ ہندو بھائیوں کی پہچان سی بن گئی ہے، اگر کسی کو دھوتی میں ملبوس دیکھا جائے تو ذہن اسی طرف جاتا ہے کہ وہ ہندو ہے، ایسی مشابہت اور مماثلت اختیار کرنا مکروہِ تحریمی ہے، علامہ ابن تیمیہؒ نے اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے (دیکھئے: اقتضاء الصراط المستقیم: ۱/ ۹۴)۔

لیکن تشبہ کی اس جہت میں تبدیلی آتی رہتی ہے؛ کیوں کہ اگر کوئی وضع ایک عہد میں کسی قوم کی پہچان بن گئی ہو اور بعد کو اس کا استعمال عام ہو جائے اور وہ کسی خاص مذہبی گروہ کی شناخت باقی نہ رہ جائے تو پھر تشبہ کی کیفیت ختم ہو جائے گی اور اس کا استعمال جواز کی حد میں آجائے گا، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے کوٹ، پینٹ کے بارے میں (دیکھئے: اقتضاء الصراط المستقیم: ۱/ ۹۴) اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے ساری کے متعلق یہی لکھا ہے (کفایت المفتی: ۹/ ۱۶۱)۔

(د) جو ملبوسات، وضع قطع اور تقریبات کسی خاص مذہبی گروہ کی پہچان نہیں ہیں، یا انتظام و انصرام سے متعلق اُمور، جیسے طرزِ تعمیر، دفتری نظم و نسق، تجارتی طور طریق وغیرہ، ان میں غیر مسلم بھائیوں کے طریقۂ کار سے استفادہ کرنے میں کچھ حرج نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حساب و کتاب کے نظام میں روم و ایران کے طریقوں سے استفادہ کیا تھا (الفاروق مکمل: ۲/ ۱۳۰) آپ ﷺ نے غزوۂ احزاب میں

حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ پر اہل فارس کے طریقہ پر خندق کھودوائی تھی (البدایۃ والنہایۃ: ۴/ ۹۵)۔

یہ اس بات پر دلیل ہے کہ ایسے امور میں غیر مسلم بھائیوں کے تجربات سے فائدہ اُٹھانے میں کوئی حرج نہیں۔

تشبہ اور مماثلت سے بچنے کا جو اُصولی حکم شریعتِ اسلامی میں دیا گیا ہے، وہ تعصب اور تنگ نظری پر مبنی نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ شناخت کی حفاظت ایک فطری عمل ہے، غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی صورت اور آواز کو ایک دوسرے سے ممتاز رکھا ہے، انسان کے اندر شناخت کی حفاظت کا جذبہ اتنا اتاہ ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم اپنی شناخت الگ رکھنا چاہتی ہے، اپنے تمدن کی حفاظت کرتی ہے، اپنے جھنڈے الگ رکھتی ہے، ہر اسکول اپنا مستقل یونیفارم رکھتا ہے، گورنمنٹ کے مختلف محکموں کے الگ الگ یونیفارم ہوتے ہیں؛ اس لئے اپنی شناخت کی حفاظت کوئی مذموم عمل نہیں ہے اور نہ اس میں دوسروں کی مخالفت اور ان کے بارے میں تنگ نظری ہے، اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان اپنی پہچان کو باقی رکھیں اور جہاں اسلامی نظام نافذ ہو، وہاں غیر مسلم بھائیوں کو بھی اس بات کی پوری آزادی فراہم کی جائے کہ وہ اپنی مذہبی وتہذیبی شناخت کے ساتھ زندگی گذاریں۔

دوسرے مذاہب کا احترام اور عدم مداخلت

مذہبی تعلقات کی دوسری بنیاد دوسرے مذاہب کا احترام اور ان کے مذہبی اُمور میں عدمِ مداخلت ہے، قرآنی تعلیمات کا نچوڑ عقیدۂ توحید کی دعوت ہے، اسلام میں توحید سے زیادہ کوئی چیز مطلوب ومحمود نہیں اور شرک سے زیادہ کوئی چیز قابل ترک اور مذموم نہیں؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے حد درجہ مذہبی رواداری کی تعلیم دی ہے، قرآن مجید نے صاف کہا ہے کہ ہر شخص کو عقیدہ کی آزادی حاصل ہے اور کسی مذہب کے قبول کرنے کے لئے جبر وتشدد جائز نہیں :

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرۃ:۲۵۶)۔

دین میں کوئی جبر نہیں ، ہدایت گمراہی کے مقابلہ میں واضح ہوچکی ہے ۔

رسول اللہ ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا :

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (یونس:۹۹)۔

کیا آپ لوگوں کو اس بات پر مجبور کردیں گے کہ وہ ایمان لائیں؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ مشہور ہے کہ انھوں نے اپنے وسق نامی غلام سے بار بار خواہش کی کہ وہ اسلام قبول کرلے، آپ رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر تم اسلام قبول کرلو تو تمہیں مسلمانوں کی امانت کی کوئی ذمہ داری سونپوں گا؛ لیکن وسق اس سے ہمیشہ انکار کرتے رہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہمیشہ اس کے جواب میں فرماتے: ''لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ'' یہاں تک کہ وفات کے قریب آپ رضی اللہ عنہ نے ان کو آزاد کردیا (کتاب الاموال:۱/ ۱۵۴)۔

مذہب پر عمل کی آزادی

عقیدہ کے علاوہ غیر مسلموں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی بھی مکمل آزادی حاصل ہے ،قرآن مجید نے صاف طور پر حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے مشرکین مکہ کو کہلایا: ''لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ'' (الکافرون:۶) ''تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین'' ایک اور موقع پر ارشاد ہے: ''لَنَا اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ'' (الشوریٰ:۱۵) ''ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال'' رسول اللہ ﷺ کی رَواداری کا حال یہ تھا کہ نجران کے عیسائیوں کا وفد بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے ان کو ان کے مذہب کے مطابق اور ان کے قبلہ کی طرف رخ کرکے مسجدِ نبوی ﷺ میں نماز ادا کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی (احکام الذمۃ:۱/ ۳۱۶) فقہاء نے لکھا ہے کہ:

اگر کسی مسلمان کی بیوی یہودی یا عیسائی ہو اور اس کے عقیدہ کے مطابق کسی خاص دن روزہ رکھنا واجب ہو تو مسلمان شوہر اسے روزہ رکھنے سے روک

نہیں سکتا ہے، گو اس کی وجہ سے وہ جنسی استفادہ کے حق سے محروم ہوتا ہے (احکام أہل الذمۃ:۱/۳۱۶)۔

اسی طرح اگر وہ اپنے عقیدہ کے مطابق صلیب پہنے، یا مسلمان شوہر کے گھر میں صلیب رکھے تو اسے یہ حق ہے اور شوہر اس کو روک نہیں سکتا (حوالۂ سابق)۔

یہ بھی ضروری ہے کہ دوسرے مذہبی گروہوں کے مذہبی جذبات کو مجروح نہ کیا جائے اور دوسری قومیں جن دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کرتی ہوں، ان کو برا بھلا نہ کہا جائے؛ حالاں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام خدا کی ذات وصفات میں کسی کی شرکت کو جائز نہیں سمجھتا؛ کیوں کہ یہ سچائی اور واقعہ کے خلاف ہے؛ لیکن پھر بھی مذہبی رواداری کے تحت ان معبودانِ باطل کے بارے میں ناشائستہ باتیں کہنے سے منع کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ (الانعام:۱۰۸)۔

وہ اللہ کے سوا جن کی عبادت کرتے ہیں، تم ان کو برا بھلا نہ کہو۔

عبادت گاہوں کا احترام

اسی طرح عبادت گاہوں کے معاملات میں بھی تمام اہل مذاہب کے جذبات کو ملحوظ رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے، قرآن مجید نے جہاں عبادت گاہوں کے منہدم کرنے کی مذمت کی ہے، وہاں مسلمانوں کی مسجدوں سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کے گرجوں کا ذکر فرمایا ہے (الحج: ۴۰) اس سے ظاہر ہے کہ عبادت گاہیں — خواہ کسی مذہب کی ہوں — ان کا احترام ملحوظ رکھنا چاہیے، رسول اللہ ﷺ نے بنو نجران سے جو معاہدہ کیا، اس میں یہ صراحت فرمائی کہ ان کی عبادت گاہیں منہدم نہیں کی جائیں گی اور نہ مذہبی اُمور میں کوئی مداخلت کی جائے گی (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۰۴۱) عہدِ صدیقی میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ذریعہ حیرہ کا علاقہ فتح ہوا، اہل حیرہ کے لئے

انھوں نے جو دستاویز تیار فرمائی، اس میں بھی یہ صراحت موجود ہے کہ ان کے چرچ اور گرجے منہدم نہیں کئے جائیں گے، امام ابو یوسفؒ نے اسے نقل کیا ہے (موسوعۃ الخراج: ۱۴۳)۔

اس سلسلہ میں خلافتِ راشدہ اور بعد کے مسلم عہد میں بہت سی مثالیں موجود ہیں، جن کا ذکر اس وقت درازیٔ تحریر کا باعث ہوگا؛ لیکن اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام عقیدۂ توحید کی حفاظت اور اپنی شناخت کی بقاء کے سلسلہ میں جس قدر حساس ہے، غیر مسلموں کے مذہبی اور سماجی مسائل میں اسی قدر کشادہ قلب، سیر چشم اور رَوادار بھی ہے، افسوس کہ اس پر غلط فہمیوں کے تہ در تہ دبیز پردے ڈال دیے گئے ہیں۔

جہاد--حقیقت اور غلط فہمی

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات کے موضوع پر شکوک وشبہات کے کانٹے آج کل جس عنوان سے بوئے جاتے ہیں، وہ ہے ''جہاد'' جہاد کی ایسی تصویر پیش کی جاتی ہے کہ گویا ہر مسلمان تلوار تھامے گھر سے نکلتا ہے اور جس غیر مسلم کو پاتا ہے اسے تہِ تیغ کر دیتا ہے، اسی لئے آج کل دہشت گردی اور جہاد کو ہم معنی الفاظ سمجھ لیا گیا ہے؛ حالاں کہ جہاد ایک قانونی عمل ہے اور دہشت گردی غیر قانونی عمل :

قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (البقرۃ : ۱۹۱)۔

اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو، جو تم سے جنگ کر رہے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

اس آیت میں ''حد سے تجاوز کرنے'' کو منع کیا گیا ہے، حد سے تجاوز کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اول یہ کہ جو لوگ تم سے برسر پیکار نہ ہوں، تم بھی ان سے جنگ نہ کرو، دوسرے یہ

کہ جب جنگ ہو تو انسانی تقاضوں اور جنگ کے مہذب قوانین کو ملحوظ رکھو، عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور معذوروں، نیز جنگ میں حصہ نہ لینے والوں اور مذہبی پیشواؤں پر ہاتھ نہ اُٹھاؤ کہ رسول اللہ ﷺ اور خلفاءِ راشدین نے جنگ میں ان لوگوں کو نشانہ بنانے سے منع فرمایا ہے (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۲۱۶۴)۔

ایک اور موقع پر قرآن نے ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے، جن سے جہاد کا حکم ہے، کہا ہے:

اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (سورۂ محمد : ۱)۔

جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ محض کفر کی وجہ سے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا؛ بلکہ کفر کے ساتھ ساتھ ان کے ظلم و زیادتی اور جبر و استبداد کے سبب جہاد کا حکم فرمایا گیا، قرآن نے اس مضمون کو ایک سے زیادہ مواقع پر بہت ہی صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جو غیر مسلم حضرات مسلمانوں سے آمادۂ پیکار نہ ہوں اور صلح جو ہوں، مسلمانوں کو بھی ان کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھانا چاہئے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

فَاِنِ اعْتَزَلُوْکُمْ فَلَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ وَاَلْقَوْا اِلَیْکُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمْ عَلَیْھِمْ سَبِیْلاً (النساء:۹۰)۔

اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں، پس تم سے جنگ نہ کریں اور تمہاری طرف صلح کی پیش کش کریں تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان کے خلاف دست درازی کی کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَھَا (الانفال:۶۱)۔

اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لئے آمادہ ہو جاؤ۔

ان آیات سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جنگ، جنگجوؤں اور شدت پسندوں سے ہے، نہ کہ صلح جوؤں اور امن پسندوں سے؛ بلکہ اگر کسی غیر مسلم گروہ سے امن کا معاہدہ ہو

اور وہ کسی مسلمان گروہ کے درپئے آزار ہوں، تو سیاسی طور پر اور پر امن طریقوں سے تو مسلمانوں کی مدد کی جائے گی اور سیاسی و اخلاقی دباؤ ڈالا جائے گا؛ لیکن ان کے خلاف قتال کرنا اور عہد کو توڑ دینا پھر بھی درست نہیں ہوگا، اس سلسلہ میں قرآن مجید کی یہ صراحت بہت ہی قابل توجہ ہے :

وَإِنِ اسْتَنصَرُوْكُمْ فِيْ الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلاَّ عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيْثَاقٌ وَاللهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (الانفال:۷۲)۔

اور اگر وہ (مسلمان) تم سے دین کے معاملہ میں مدد کے طلب گار ہوں تو تم پر ان کی مدد کرنا واجب ہے؛ لیکن ایسی قوم کے خلاف نہیں کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو اور تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اسے دیکھ رہے ہیں۔

قرآن مجید کے ان ارشادات کو سامنے رکھ کر یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جہاد کا حکم کن لوگوں سے ہے؟ صرف ان لوگوں سے، جو مسلمانوں سے جنگ کرنے پر تلے ہوئے ہوں، جن لوگوں سے مسلمانوں کا معاہدۂ امن ہو یا جو لوگ غیر جانبدار رہوں، نہ ان سے جنگ ہو اور نہ ان سے کوئی معاہدہ ہو، ایسے لوگوں سے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا اور یہ بات ظاہر ہے کہ یہ بالکل انصاف کے عمومی اُصول اور تقاضے کے مطابق ہے کہ ظالموں کا پنجہ تھاما جائے اور انھیں ظلم سے باز رکھا جائے، جو لوگ مسلمانوں سے جنگ نہ کرتے ہوں اور انھیں مشرکین مکہ کی طرح وطن سے بے وطن ہونے پر مجبور نہ کر رہے ہوں، ان کے ساتھ جنگ کے بجائے حسن سلوک اور صلح و آشتی کا حکم دیا گیا؛ چنانچہ ارشاد ہے :

لَا يَنْهٰكُمُ اللهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِيْ الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (الممتحنة:۸)۔

جو لوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کرتے ہیں اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکال رہے ہیں، اللہ تعالیٰ تم کو ان کے ساتھ

بہتر سلوک کرنے اور انصاف کرنے سے نہیں روکتے ، بے شک اللہ
انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔

حیات نبوی اور جہاد

رسول اللہ ﷺ کی مدنی زندگی میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تصادم کے کل بیاسی (۸۲) واقعات پیش آئے ہیں اور زیادہ تر جنگیں مدینہ کے قریب ہوئیں ، جو اس بات کی علامت ہے کہ اس میں مسلمان حملہ آور نہیں تھے ، ان بیاسی واقعات میں کل ۱۰۱۸ / افراد دونوں طرف سے کام آئے اور اوسطاً ایک جنگ میں گیارہ جانیں گئیں ، یہی وہ تعداد ہے ، جس کی وجہ سے اسلام کے بارے میں غلط فہمی پھیلائی جاتی ہے کہ اسے تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے ، جب کہ مہابھارت کی ''مقدس جنگ'' میں لاکھوں افراد خود ہندو مذہبی مآخذ کے مطابق مارے گئے اور عیسائی مذہبی عدالت کے حکم پر ایک کروڑ بیس لاکھ افراد کو سزائے موت دی گئی اور ان میں ایک بہت بڑی تعداد وہ تھی ، جن کو زندہ جلا دیا گیا ؛ لیکن افسوس کہ مغربی اقوام جن کی پوری تاریخ غارت گری ، خوں آشامی اور استعماریت کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے ، انھوں نے ''چور مچائے شور'' کے مصداق بڑی ہوشیاری کے ساتھ مسلمانوں کی تاریخ پر لکھ دیا :

بوئے خوں آتی ہے ، اس قوم کے افسانوں سے

جزیہ کی حقیقت

آج کل وی ، ایچ ، پی کے لوگ اسلام کو بدنام کرنے کے لئے جزیہ کے مسئلہ کو بھی اُٹھا رہے ہیں ؛ لیکن یہ کوئی نیا اعتراض نہیں ہے ، پہلے بھی مستشرقین کی جانب سے اس قسم کے سوالات اُٹھائے جاتے رہے ہیں ، اہل علم نے تفصیل سے اس کا جواب دیا ہے ، خلاصہ یہ ہے کہ جزیہ سے مراد وہ خصوصی ٹیکس ہے جو اسلامی حکومت غیر مسلم رعایا سے ان کی جان و مال کی حفاظت

کے طور پر وصول کرتی ہے، صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں پر زکوٰۃ واجب ہے، جسے حکومت وصول کرتی ہے، اگر غیر مسلموں پر بھی زکوٰۃ واجب قرار دی جاتی تو یہ انھیں ایک اسلامی عمل پر مجبور کرنے کے مترادف اور مذہبی آزادی کے مغائر ہوتا؛ اس لئے ان پر ایک جداگانہ ٹیکس ''جزیہ'' کے نام سے لگایا گیا، جو ان کی جان و مال کی حفاظتی نظام کا معاوضہ ہے، یہ ان کے حالتِ کفر میں ہونے کا تاوان نہیں، اگر ایسا ہوتا تو عورتوں، بچوں، بوڑھوں، بیماروں، معذوروں، بے روزگاروں اور ان سب سے بڑھ کر مذہبی طبقہ یعنی پادری، پنڈت وغیرہ سبھوں پر واجب قرار دیا جاتا؛ لیکن ان حضرات کو جزیہ سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے؛ (دیکھئے: احکام الذمۃ: ۱/۱۴۸، ھدایہ: ۴/۳۱۸، باب الجزیۃ) اس لئے اس کی حیثیت محض ایک ٹیکس کی ہے، نہ کہ تاوان کی۔

پھر اس جزیہ کی مقدار بھی کس قدر معمولی ہے؟ کم آمدنی والوں کے لئے سالانہ بارہ درہم، متوسط آمدنی والوں کے لئے سالانہ ۲۴ اور زیادہ آمدنی والوں کے لئے ۴۸ درہم (بیہقی: ۹/۳۲۹، حدیث نمبر: ۱۸۶۸۵، باب الزیادۃ علی الدینار بالصلح) ۱۲ درہم ۱۳ تولہ سے کم چاندی ہوتی ہے، موجودہ نرخ کے لحاظ سے ۱۲ درہم ۲۶۵ روپے سے کچھ کم وبیش ہے، آپ حضرات خود غور کریں کہ اگر کوئی مملکت کسی شہری کی حفاظت اور سیکورٹی پر سال بھر میں اتنا حقیر معاوضہ وصول کرے تو کیا یہ زیادتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہماری حکومت اتنے پیسے لے کر باشندگانِ ملک کی حفاظت کا انتظام کردے اور ان کے تحفظ کی ضمانت قبول کرے، تو ہم شکر گزار ہوں گے، یہ اس جزیہ کی حقیقت ہے، جس کو لے کر معاندین نے ایک طوفان کھڑا کیا ہوا ہے اور اس کو اسلام کے خلاف ظلم وزیادتی، تشدد اور ناروا داری کا عنوان دیا گیا ہے۔

غیر مسلموں سے دوستی

دوسری غلط فہمی جو اس وقت عالمی سطح پر پائی جاتی ہے، یہ ہے کہ اسلام نے غیر مسلموں کو دوست بنانے سے منع کیا ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

يَـا أَيُّهَـا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا الْكَافِرِيْنَ أَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ، أَتُرِيْدُوْنَ أَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَاناً مُّبِيْنًا (النساء:۱۴۴)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ، کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح حجت دے دو؟

اس سلسلہ میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا اس سے وہ مشرکین مراد ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں مسلمانوں سے آمادۂ پیکار تھے یا قیامت تک آنے والے تمام غیر مسلم اس میں شامل ہیں؟ قرآن کی تعبیر اور آیت کے سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے عہد نبوی کے وہ غیر مسلم مراد ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ نہایت ظالمانہ رویہ روا رکھے ہوئے تھے؛ اس لئے کہ ایک تو قرآن نے اکثر ''کافرین'' کے لفظ سے ''مشرکین مکہ'' کو مراد لیا ہے، دوسرے: خود قرآن مجید میں دوسرے مقام پر اس بات کی صراحت آ گئی ہے کہ ان لوگوں کی دوستی منع ہے، جنھوں نے مسلمانوں سے جنگ کی، ان کو ان کے وطن سے نکالا اور ان کے بے وطن کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کی؛ چنانچہ ارشاد ہے :

اِنَّـمَا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قَاتَلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَأَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَـارِكُـمْ وَظَـاهَـرُوْا عَلٰى إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ ، وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَأُوْلٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ (الممتحنة:۸-۹)۔

وہ تمہیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنھوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے، ان سے جو لوگ دوستی کریں وہی ظالم ہیں۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ آیت میں عہد نبوی کے ان مشرکین کی دوستی

سے منع کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ انتہائی درجہ معاندانہ رویہ اختیار کئے ہوئے تھے اور آج بھی جو لوگ اس طرح کا رویہ اختیار کریں ان کے لئے یقیناً یہی حکم ہوگا، عام غیر مسلموں کے لئے یہ حکم نہیں ہے، خود اس آیت میں غور کیجئے کہ اس میں ''مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ'' کے الفاظ موجود ہیں، یعنی غیر مسلموں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں اور ان کو چھوڑ کر دوست نہ بنالو۔

پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اولیاء بنانے سے کیا مراد ہے؟ عام دوست کو ولی نہیں کہتے ہیں، ولی ایسے قریب ترین شخص کو کہا جاتا ہے جس سے بے حد قربت ہو، یہاں تک کہ کوئی راز اس سے راز نہ رہے، اس لئے والد، دادا اور سرپرست کو ''ولی'' کہتے ہیں، پس آیت کا منشا یہ ہے کہ مسلمانوں کا راز ان غیر مسلموں کے پاس نہ چلا جائے جو تم سے برسر پیکار ہیں اور یہ بات ظاہر ہے کہ ہر ملک اپنے راز کی باتوں کو چھپانا چاہتا ہے؛ تاکہ دشمن اس سے فائدہ نہ اُٹھا سکے، عام دوستانہ تعلقات اس میں مراد نہیں ہیں۔

اس پر ایک اور طرح سے غور کیا جاسکتا ہے کہ شریعت اسلامی میں مسلمانوں کو یہودی اور عیسائی عورت سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے، اس لئے مسلم سماج میں غیر مسلم ماں اور غیر مسلم بیوی کا وجود ہوسکتا ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ تمام رشتوں میں سب سے زیادہ محبت کا رشتہ ماں اور بیوی کا ہوتا ہے، تو اگر غیر مسلموں سے محبت اور دوستی کی مطلقاً ممانعت ہوتی تو ان سے اس طرح کا رشتہ کیسے جائز ہوتا؟ غرض کہ غیر مسلموں کو دوست بنانے کی ممانعت کا تعلق ان غیر مسلموں سے ہے، جو صرف مذہبی اعتبار سے مسلمانوں سے اختلاف ہی نہ رکھیں؛ بلکہ ان کا سلوک بھی معاندانہ ہو، نیز دوستی سے مراد ایسی دوستی ہے جو مسلم مملکت کے محفوظ راز کے افشاء ہوجانے کا سبب بن سکتی ہو، یا بعض مفسرین کے اقوال کے مطابق دوسرے اہل مذاہب سے مذہبی اثرات اور طور وطریق کو قبول کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہو، عام دوستی، محبت اور تعلق جو سماج کے ایک شخص کی دوسرے شخص سے ہوتی ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔

پس چہ باید کرد؟

ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان اپنے غیر مسلم بھائیوں کو غیر مسلموں کے بارے میں اسلام کی حقیقی تعلیمات، اس کی سیر چشمی، فراخ قلبی اور رواداری سے آگاہ کریں اور خود اپنے رویہ اور برتاؤ سے ثابت کریں کہ اسلام کوئی شدت پسند اور نا روادار مذہب نہیں ہے ؛ بلکہ انسانیت پرور، آدمیت نواز، رحم دل، حد درجہ روادار اور سیر چشم وفراخ قلب مذہب ہے اور اس کی ٹھنڈی چھاؤں نہ صرف مسلمانوں ؛ بلکہ پوری انسانیت کے لئے مسکن رحمت ہے۔

اِن الدین عند اللہ الاِسلام ، اللّٰھم أرنا الحق حقا وارزقنا اتباعه ، وأرنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه ۔